# جمہوریت کی کہانی

از جناب نعیم صدیقی

[ برادرم مکرمی جناب نعیم صدیقی صاحب نے یہ قابلِ قدر مقالہ چند ماہ قبل لکھنا شروع کیا مگر آگے چل کر جب بحث و تحقیق کا میدان پھیلتا نظر آیا تو انہوں نے اس کام کو ایک نئے اور جامع نقشے سے کرنے کا خاکہ بنایا۔ میں نے جب اس مضمون کو اُن سے لے کر مطالعہ شروع کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں بعض بڑے مفید مباحث موجود ہیں۔ اگرچہ انہیں اصرار یہ تھا کہ اسے اس موجودہ صورت میں شائع نہ کیا جاتے مگر اس کی افادیت کے پیش نظر اسے موجودہ صورت ہی میں اشاعت کے لیے دیا جا رہا ہے۔ مضمون کی باقی اقساط انشاء اللہ مجوزہ نقشہ کے مطابق ہی تیار ہو کر قارئین کی خدمت میں پیش کی جائیں گی ـــــ ع - ح - ص ]

جمہوریت! ـــــ اسلامی جمہوریت، مغربی جمہوریت، پارلیمانی اور صدارتی جمہوریت، مضبوط اور قابلِ فہم جمہوریت ـــــ ہماری گفتگوؤں، تحریروں اور تقریروں کا ایک اہم موضوع رہی ہے مگر اس موضوع پر اردو زبان میں ہم نے بہت کم سرمایۂ فکر و تحقیق جمع کیا ہے۔ اسی احساس کے تحت اس مقالہ کا آغاز کیا جا رہا ہے۔

انسان ذہنی، تمدنی، سماجی اور معاشی حیثیت سے آج جس مقام پر کھڑا ہے اس تک پہنچنے کے لیے اس نے بیش بہا مشقتیں برداشت کی ہیں اور بے اندازہ قربانیاں دی ہیں۔ تاریخ کی کھیتی بنی نوعِ آدم نے اپنے خون کے فواروں سے سیراب کی ہے، اس میں اپنی ہڈیوں کی کھاد ڈالی ہے اور اس کی کیاریوں میں آنسوؤں کی شبنم برسائی ہے۔ اس خاکی مخلوق نے فطرت کی طاقتوں ـــ موسمی حالات، درندوں، زلزلوں اور مختلف طبعی حوادث

کا سامنا کر کے ہی کڑے امتحان نہیں دیئے ہیں بلکہ خود اپنی نوعی برادری کے ہاتھوں سنگین ترین مظالم برداشت کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ کے دردناک ترین حزنیے وہ ہیں جو خود انسان کے ہاتھوں سے پیش آئے۔ حملہ آوروں اور مجرموں، جباروں اور ظالموں نے بار بار اس بری طرح تہذیب کے چہرے کو لہولہان کیا کہ آج بھی ہم اپنے ان تاریخی زخموں کی ٹیسیں محسوس کرتے ہیں۔

**تاریخ کا سب سے بڑا بھگتان** انسانیت نے اپنے ہی فرزندوں کے ہاتھوں جو بھگتان بھگتے ہیں ان میں سے سب سے اذیت ناک اور روح کش تجربہ نظامِ استبداد کا تھا جو مختلف زمانوں میں مختلف روپ اختیار کرتا رہا ہے۔ کبھی فاتحین کی لہراتی ہوئی تلواروں نے اسے گردن جھکانے پر مجبور کیا، کبھی اشرافی طبقوں کے گٹھ جوڑ سے موروثی بادشاہت نے اپنے تخت کے پائے اس کے کندھوں پر ٹکائے، کبھی درباری سازشوں کے کامیاب ہیروؤں نے اسے اپنا شکار بنایا اور کبھی مذہبی طبقوں نے اپنی غلامی کا مقدس جوا اس کے گلے میں ڈالا۔ نظامِ استبداد نے اس سے اس کی کمائیاں چھینیں، اس سے بیگاریں حاصل کیں، اس کی کھال کوڑوں سے ادھیڑی اور جب چاہا اسے کولہو میں پیل دیا۔ نظامِ استبداد نے بدترین ظلم اس کے ساتھ یہ روا رکھا کہ اس سے اس کے ضمیر کی آزادی چھین لی، اسے خودی سے محروم کر دیا، اس سے اپنے بھلے برے کے سوچنے کا حق سلب کر لیا، اس کے لیے اظہارِ خیال کی راہیں بند کر دیں۔ یہ کتنی بڑی گھٹن ہوگی کہ آدمی اس مبغوض طاقت کے سامنے سجدۂ اطاعت گزار رہے جسے اس کی روح اپنا جائز فرماں روا نہیں مانتی ہے، ان قوانین اور ضابطوں اور احکام کی تعمیل کرے جو مطمئن کرنے والی کسی دلیل پر مبنی نہیں ہیں، اس نظام کو واجب الاحترام مانے جس کی تشکیل میں اس کی آزاد مرضی کا کوئی حصہ نہیں ہے، اس تمدن کی حفاظت کرے جس میں اس کی فلاح و بہبود کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ انسان کو ایسے عقیدے اور نظریے ماننے پر مجبور کیا گیا جن سے

اس کے عقل و وجدان کو انکار تھا، اس سے ایسے ضابطوں کی تائید حاصل کی گئی جن کو وہ دل سے لغو سمجھتا تھا، اس سے ایسے نظاموں کے لیے قربانیاں مانگی گئیں جن کو وہ جھوٹ اور بدی کے بڑے پیمانے کے مظاہرے قرار دیتا تھا۔ اسے ایسی حالتِ خوف میں رکھا گیا جس میں اپنے شرفِ انسانیت کو محسوس کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اسے نظامِ استبداد نے صدیوں در صدیوں لمبے زمانوں میں ایک بے بس جانور بنائے رکھا۔

لیکن یہ انسانی عظمت کا ایک بدیہی ثبوت ہے کہ بربریت کے ہاتھوں سنگین حالات کی چکی میں متواتر پسنے، کندھوں پر جبراً اٹھنے ہوئے فرائض کے کوہ گراں لادے رکھنے، پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں زنجیریں پہننے اور ضمیر پہ پہرے اور زبان پر مہریں لگنے کے باوجود انسان کی خودی پھر بھی سر اٹھاتی رہی۔ انسانیت نے تلواروں کی چھاؤں میں کھڑے ہو کر، انگاروں پہ لوٹ کر اور پھانسیوں پر لٹک کر ظلم کی طاقت کو چیلنج کیا اور اس سے آزادی اور مساوات اور جمہوریت کا حق مانگا۔ ہر دوسرے مقصد سے زیادہ عظیم اور وسیع قربانیاں اس مقصد پر صرف ہوئیں اور آج انہی قربانیوں کے طفیل اس کرۂ ارضی پر یہ ممکن ہوا ہے کہ آدمی انسانیت کے بنیادی حقوق سے استفادہ کر سکے یا کم از کم زیادہ جرأت اور سہولت کے ساتھ ان حقوق کا مطالبہ کر سکے۔

نظامِ استبداد ـــــ چاہے وہ دورِ قدیم کی بادشاہت کی شکل میں ہو یا دورِ حاضر کی انفرادی یا جماعتی آمریت کی شکل میں، بلکہ وہ کسی جمہوری قبا میں کیوں نہ پاکوبی کر رہا ہو ـــــ وہ لازماً انسانی مساوات کی نفی پر کھڑا ہوتا ہے۔ کوئی فرد، کوئی خاندان، کوئی پارٹی یا کوئی طبقہ جب قوت کی تلوار سونتے نمودار ہوتا ہے اور غیر محدود شدہ اقتدار اس کے ہاتھ آجاتا ہے تو وہ حکم چلانے، لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے، لوگوں کے بھلے برے کو سوچنے، آزادیوں پر قدغنیں اور افکار و اعمال پر پابندیاں عاید کرنے، حقوق و فرائض کی تقسیم کرنے اور خیر و شر کے پیمانے بنانے کا واحد اجارہ دار بن بیٹھتا ہے۔ وہ دوسروں کو سوچنے،

استدلال سے کام لینے، اظہارِ رائے کرنے، اختلافی آواز اٹھانے اور تنقید و احتجاج کرنے سے بالجبر باز رکھتا ہے۔ وہ اذن نہیں دیتا کہ محکوم حالات میں کوئی تبدیلی کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ وہ عوام کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی ہر مرضی کی تائید کریں، اس کی ساری حماقتوں پر داد دیں، اس کے انتہائی سیاہ کارانہ مظالم پر خراجِ تحسین پیش کریں۔ غرضیکہ وہ نظامِ زندگی کو ایک ایسا فولادی پنجرہ بنا دیتا ہے جس میں انسانی خودی پھڑپھڑاتی رہتی ہے اور کوئی راہِ نجات نہیں پاتی۔ انسانی عزم کا سب سے زریں کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس فولادی پنجرے کو بھی توڑ ڈالا ؎

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

ظلم کی چکی میں پستے ہوئے انسان بھی یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے کہ "ہم بھی انسان ہیں" ان کے خاکستر میں شعورِ مساوات کی چنگاری بار بار تپش دکھاتی رہی اور جب یہ پوری طرح بھڑک اٹھی تو قفسِ استبداد کی سلاخیں پگھل گئیں۔ "ہم بھی انسان ہیں" اور "ہم بھی سوچتے ہیں" کا شعور ہمیشہ چیخ اٹھتا رہا کہ ع

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

وہ حالت نظامِ استبداد کے بالکل برعکس ہوتی ہے جبکہ نظامِ حیات مساواتِ انسانی کے تصور پر کھڑا ہو جائے۔ ایسے نظام کو دورِ جدید کی اصطلاح میں "جمہوریت" کہتے ہیں۔

**انبیاء کا درسِ مساوات** | جمہوریت کی کہانی کا آغاز بالعموم یونان کی یک شہری اشرافی ریاست کے تذکرے سے کیا جاتا ہے۔ فی الحقیقت اس کی ابتدا بہت دور سے ہوتی ہے۔ اس کے اصل علمبردار اور داعی وہی رہنمایانِ انسانیت تھے جنہوں نے اسے دوسری تمام زندگی افروز درخشاں قدروں سے مالا مال کیا ہے۔ یعنی انبیاء علیہم السلام ۔۔۔ انبیاء نے

خدائے واحد کا وہ تصور دلایا جو تمام انسانوں کو ایک ہی مقامِ عبدیت پر لے آتا ہے۔ سارے انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں، سارے انسان یکساں خاکی نژاد ہیں، سارے انسان ایک فطرت پر اٹھائے گئے ہیں اور یکساں ضروریات رکھتے ہیں، سارے انسان دل و دماغ سے آراستہ ہیں۔ سارے انسان سوچتے ہیں اور سارے انسان زندگی اور تمدن میں یکساں حصہ دار ہیں۔ ان میں سے کوئی دوسروں پر خدائی جمانے کا حقدار نہیں، کوئی اپنا من مانا حکم چلانے کا اجارہ دار نہیں، کوئی دوسروں کی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے والا نہیں، کوئی اوروں کے بھلے اور برے کا فیصلہ کرنے والا نہیں، کوئی دوسروں پر فوقیتیں، ترجیحات اور امتیازات نہیں رکھتا، کوئی دوسروں کے ضمیروں اور ذہنوں پر قدغنیں لگانے کے لیے خصوصی اختیارات لیکر پیدا نہیں ہوا، اور کسی کو قدرت نے ظلم و استبداد کرنے کا پٹہ لکھ کر نہیں دیا۔ جبر و استبداد کے خلاف قدیم ترین ادوار میں اسی تصور نے بغاوت کی لہریں اٹھائی ہیں۔ اسی تصور کو لیکر انبیاء اور ان کے پیروؤں نے بڑی بڑی ظالم قوتوں کو چیلنج کیا ہے۔ ہم ابراہیم علیہ السلام کو نمرود کے سامنے، موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے سامنے، عیسیٰ علیہ السلام کو رومی حکومت کے سامنے اسی تصورِ خدا، تصورِ انسان اور اصولِ مساوات کا پیغام سناتے دیکھتے ہیں۔ اس راہ میں نہایت ہی عظیم قربانیاں دینے والے بھی خود انبیاء ہی تھے۔ کہیں ان پر پتھروں کی بارش ہوتی ہے۔ کہیں ان کو آگ کے الاؤ میں پھینکا جاتا ہے، کہیں انہیں اسیر زنداں کیا جاتا ہے کہیں ان کے لیے سولیاں آراستہ کی جاتی ہیں اور کہیں ان کے سروں پر آرے چلا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی اٹھائی ہوئی آوازِ حق کی گونج ختم نہ کی جا سکی اور ان کی قربانیاں آہستہ آہستہ رنگ لاکر رہیں۔ انہی کی انسانیت نواز یاد ہے کہ انسانیت کے بہت سے بنیادی حقوق کم از کم اصولی طور پر آج دنیا کے مسلّمات میں داخل ہو چکے ہیں۔ سچی اور مکمل جمہوریت کے نمونے وہ نظام تھے جو ان رہنمایانِ عالم کے ہاتھوں قائم ہوتے رہے۔

**انسانی نظامِ اخوت** انبیاء کے مشن کی تکمیل سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے

ہوتی۔ حضورؐ ایسے دور میں اپنا پیغامِ انقلاب لے کے اٹھے تھے جبکہ نظامِ استبداد اپنے جوبن پر تھا۔ روم و ایران اس وقت انسانی تمدن کے قافلہ سالار تھے، لیکن ان کا حال یہ تھا کہ بادشاہت، درباری اشراف، جاگیردار اور مذاہب کے اجارہ دار اپنی ملی بھگت سے انسانیت کو استبداد کی قفس میں جکڑے ہوتے تھے۔ عام انسان چند خواص کی خدائی کا جوا اٹھائے ہوتے تھا اور اسے مجالِ دم زدن نہ تھی۔ خود عرب میں قریشی متولیانِ کعبہ، مکہ اور طائف کے سود خواروں اور جرائم پیشہ قبیلوں نے عام لوگوں کے لیے غلامی، خوف اور بے بسی کی حالت پیدا کر رکھی تھی۔ ایسے میں آپ توحید کے ساغر میں انسانی مساوات کی وہ صہبا لے مقدس پیش کرتے ہیں کہ جس کا ایک جرعہ پی کر غلام اور کنیزوں تک میں احساسِ آزادی کا وہ نشہ پیدا ہوا کہ اگرچہ ان کو تپتی ریتوں پر لٹایا گیا، دہکتے انگارے ان کی پیٹھوں کے نیچے ٹھنڈے ہو گئے، گلوں میں رسیاں ڈال کر ان کو گھسیٹا گیا، ان کی چھاتیوں پر بھاری پتھر رکھے گئے، ان کو مار مار کر ادھ مؤا کر دیا گیا اور برچھیاں ان کے جسموں سے پار کی گئیں مگر ان کے سرورِ ازلی میں فرق نہ آیا۔ جب انہوں نے اپنے شرفِ انسانی کے تصور کا ذائقہ چکھ لیا تو پہلی بار ان کے شعور نے انگڑائی لی، ان کی قوتِ ارادی جاگ اٹھی، ان کے کردار نے نئی کونپلیں چھوڑیں اور ان میں ظلم کو بے حسی سے سہنے کے بجائے پورے نظامِ ظلم کے خلاف انقلابی جدوجہد کرنے کا ولولہ بیدار ہو گیا۔ یہاں تک کہ انسانوں کا ایک معیاری نظامِ اخوت قائم ہوا جو قیام کے بعد دس ہی برس میں دس بارہ لاکھ مربع میل علاقے پر چھا گیا۔

ہم اس نظام کا تفصیلی خاکہ آخری حصے میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نظام اقتصادی مساوات، ذہنی مساوات، سیاسی مساوات، قانونی مساوات اور معاشی مساوات کے کامل ترین مگر قابلِ عمل اصولوں پر مبنی ہے۔

اسلام اور یورپ کا دورِ جدید: یورپ کے ذہنی مطلع پر دورِ جدید کی جو پہلی روشنی نمودار ہوئی وہ اسلام کی ان چند شعاعوں کا نتیجہ تھی جو یلغار کرتی ہوئی اُس پار جا پہنچی تھیں۔

قدرت کا یہ تاریخی قانون کہ جس قوم کے پاس اعتقاد، فکر، علم اور اخلاق کی روشنی موجود ہوتی ہے (— اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسی متاعِ خیر کے ساتھ کچھ اسبابِ فساد بھی خلط ملط ہو جاتے ہیں) وہ امامت و قیادت کے منصب پر آجاتی ہے اس کے اندر ایک طرح کا احساسِ فرض پیدا ہو جاتا ہے کہ انسانی فلاح کا جو پیغام اس کے پاس ہے اسے دنیا کے ہر گوشے تک پہنچائے۔ اسلام نے جب اپنے پیروؤں کو زندگی کی حقیقت کا نیا شعور دیا، ان کو اخلاقی رُخ سے آراستہ کیا، ان کے ذوقِ علم و عمل کو بیدار کر دیا، انہیں نئے نئے سیاسی و سماجی ادارات کا معمار بنا دیا تو قانونِ فطرت کے تحت از خود ان کا منصب یہ قرار پایا کہ وہ فکر و عمل کی نئی روشنی کو ساری دنیا میں پھیلا دیں۔ اس مقصد کے لیے دینِ حق نے ان کو شہداء علی الناس اور امت وسط قرار دیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا بین الاقوامی مشن ٹھہرایا۔ چنانچہ مسلم قوت جب اپنی مشعلِ دعوت اٹھا کے ریگستانِ عرب سے نکلی تو ان کے سامنے زمینیں فتح کرنے اور دولت حاصل کرنے اور سلطنت بنانے کا مقصد نہ تھا بلکہ وہ انسانیت کے سامنے فلاح کا سندیسہ لے کر معلمانہ جذبے سے گئے اور عام آدمی کو انہوں نے سیاسی، مذہبی، معاشی اور سماجی استبداد کی زنجیروں سے نجات دلانے کا فرض ادا کیا۔ انہوں نے اسی جذبے سے روم و ایران کی شہنشاہیتوں کو توڑا اور عوام کو ایک نظامِ رحمت سے مالا مال کر دیا۔ پھر جو یہ سلسلہ چلا تو مصر، افریقہ، ہند و افغانستان، چین و ترکستان اور ہسپانیہ و اندلس تک فتوحات کے ریلے بڑھتے چلے گئے۔ اگرچہ خلافتِ راشدہ کے سقوط کے بعد جب بادشاہت کا دور شروع ہوا تو سلطنت خود ایک مقصود بن گئی اور فتوحات سیاسی و اقتصادی فوائد کے لیے بھی کی جانے لگیں مگر ان کوششوں میں داعیانہ و معلمانہ روح بھی دبی دبی موجود رہی۔ شاہانہ فتوحات بھی اسلامی نظریۂ توحید، افکار و علوم، تمدنی ادارات، اخلاقی اقدار، اصولِ عدل و مساوات اور خدا پرستانہ ثقافت جیسی نعمتوں کو انسانیت تک پہنچانے کا ذریعہ بنتی رہیں

دورِ بادشاہت ہی میں اسلام کی روشنی مغربِ اقصیٰ تک پہنچی۔ عبدالملک اموی کے دور میں عقبہ بن نافع کی یلغار طنجہ تک جا پہنچی (۶۸۳ء) اس کے بعد قرطاجنہ (CARTHAGE) پر مستقل قبضہ (۶۹۸ء) میں ہوا۔ سلیمان (۷۱۵ء تا ۷۱۷ء) کے عہد میں محمد بن عبدالرحمٰن الثقفی نے جبل البرانس سے گزر کر جنوبی فرانس پر حملہ کیا۔ ہسپانیہ میں باقاعدہ اسلامی حکومت کا آغاز جنرل طارق کی فاتحانہ یلغار سے ہوا۔ (۷۱۱ء) جو جنرل موسیٰ بن نصیر کے تعاون سے پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اموی خلیفہ ہشام کے پوتے امیر عبدالرحمٰن (۷۵۶ء تا ۷۸۸ء) نے ہسپانیہ میں باقاعدہ اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ تعمیری سرگرمیوں کا دور، عبدالرحمٰن ثالث کے دور (۹۱۲ء تا ۹۶۱ء) میں ہوا اور قرطبہ نہ صرف سیاست، تجارت و صنعت کا بڑا مرکز ٹھہرا بلکہ یورپ کا سب سے بڑا سرچشمۂ علم و فکر بن گیا۔ طب، ریاضیات، فلسفہ و حکمت اور شعر و ادب کی درسگاہیں کھل گئیں، کتب خانے قائم ہو گئے یونانی اور لاطینی کتابوں کے تراجم کی مہم چل پڑی اور ساتھ کے ساتھ صنعت کاغذ سازی کو فروغ حاصل ہوا۔ یہی درسگاہیں، دارالتراجم، کتب خانے، کاغذ کے کارخانے اور علمی حلقہ ہائے بحث اسلام کے علم و فکر کو یورپ کے ہاتھ منتقل کرنے کا واسطہ بنے۔ اسی واسطے سے انسانی مساوات، علمی بیداری اور فکری آزادی کا پہلا پیغام مغرب کے ظلمت زدہ انسان کو ملا۔ ایچ۔ جی۔ ویلز بتاتا ہے کہ:

> "عرب فاتحین کے نقوشِ قدم کے ساتھ ساتھ علم کی لہریں اٹھتی چلی گئیں۔ آٹھویں صدی تک عربوں کی پوری زیرنگیں دنیا میں ایک طرح کی تعلیمی تنظیم کارفرما ہو گئی"[1]

اور ــــ

> "ارسطو اور کتب خانۂ اسکندریہ کے بیج جو عرصہ دراز سے بے نمو اور نظرانداز شدہ تھے، از سرِ نو تازہ ہو گئے اور برگ و بار لانے کے لیے نشو و نما پانے لگے"[2]

---

[1] ملاحظہ ہو POCKET HISTORY OF THE WORLD. P: 214.

[2] ایضاً ص ۲۱۶۔

اور ——

"دنیا بھر میں عام آدمی کا ذہن اس شان سے یک بیک بیدار ہوا کہ اس سے پہلے انسانیت کو ایسا تجربہ کبھی پیش نہ آیا تھا۔"[1]

ایک حوالہ اور ——

"وہ (یعنی چارلس مارٹل) مسلمانوں کو فرانس سے نکال دینے میں کامیاب ہو گیا مگر وہ ہسپانیہ میں جمے رہے جہاں عبدالرحمٰن نے کارڈوا کی خلافت کی بنا رکھی جو قرونِ وسطیٰ کے یورپ کے لیے حکمت و فنون کا عظیم ترین مرکز بن گیا۔"[2]

ایک قول برلیفالٹ کا بھی ——

"... بلکہ اسلامی تمدن نے یورپ کی زندگی پر بہت عظیم الشان اور مختلف النوع اثرات ڈالے ہیں اور ان کی ابتدا اسی وقت سے ہو جاتی ہے جب اسلامی تہذیب و تمدن کی پہلی کرنیں یورپ پر پڑنی شروع ہوئیں۔"[3]

یہ تھا نقشہ احوال جس میں مسلمانوں کا اصولِ مساواتِ انسانی فکری آزادی کی رَو اپنے ساتھ لیے ہوتے مغرب تک پہنچا اور یہی تحریکِ اصلاحِ مذہب، فکری نشاۃ ثانیہ اور جمہوری تحریک کا اوّلین محرک بنا۔ مساواتِ انسانی کے اسلامی اصول کا مغربی تصانیف میں اعترافِ عام پایا جاتا ہے۔ ایچ جی ویلز بھی "خدا کے سامنے تمام اہلِ ایمان کی مکمل اخوت و مساوات" کو ایک اصولی حقیقت، اور عربوں کی کامیابی کی کلید سمجھتا ہے۔ (ہسٹری آف ورلڈ صفحہ ۲۱۱)۔ اس کے نتیجے میں پہلے پاپائیت کے خلاف اور پھر بادشاہت کے خلاف بغاوت کا آغاز ہوا۔ بعد میں اسلامی اثرات کی ایک نئی پُرزور لہر صلیبی جنگوں کے دوران میں مغرب تک پہنچی صلیبی

---

[1] POCKET HISTORY OF THE WORLD – BY H. G. WELLS. P. 354

[2] THE STORY OF MANKIND — H. VAN LOON.. P: 143

[3] THE MAKING OF HUMANITY. P: 19

جنگیں لاکھوں یورپین نوجوانوں کے لیے ایک عمومی درسِ تہذیب بن گئیں۔ ہوتا یہ کہ جب صلیبی جنگجو میدان سے لوٹ کر جاتے تھے تو وہ ان اعلیٰ اطوار کے معترف اور مبلغ بن کے جاتے تھے جن کا مشاہدہ وہ دشمن مسلمانوں میں کر چکے ہوتے تھے۔ ان میں وسیع تر طرزِ زندگی کی تمنا انگڑائیاں لینے لگتی تھی جو نہ کلیسا انہیں دے سکتا تھا، نہ ریاست[1] اور پھر ان کا تاثر یہ تھا کہ :

"مبارک ہے صلاح الدین جس کی گردن پر کسی پوپ کا جوا نہیں"[2]

پھر تیسری بار نئی فکری و تمدنی لہریں اس وقت یورپ کی طرف اٹھیں جبکہ سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ کو فتح کیا (۱۴۵۳ء) اور اس علمی مرکز سے عیسائی علماء، مفکرین اور اساتذہ کی تعدادِ کثیر بھاگ کر اٹلی میں پناہ گزین ہوئی اور یورپ کو ایسے بے شمار معلمین ہاتھ آ گئے جنہیں مسلم فکر نے روشن دماغ بنایا تھا[3] اور یہ واضح ہے کہ ۱۵ ویں صدی کے اواخر سے سولہویں صدی تک کا دورِ نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) کا دور ہے[4]۔ پاپائیت کے خلاف معرکہ | اسلام کا پہلا نمایاں اثر یورپ پر یہ پڑا — اور اس میں دوسرے تاریخی اسباب بھی یقیناً ممد ہو گئے — کہ کلیسا کے خوفناک استبداد، پوپ کی خداوندی اور مذہبی اوہام و رسوم کے خلاف معرکہ کا آغاز ہوا۔ اس معرکہ میں ذہنی جمہوریت کی روح کارفرما تھی۔

کلیسائے روم ایک ایسے مذہب کا بارِ گراں عوام پر لادے ہوئے تھا جو انھیں

---

[1] THE STORY OF MANKIND P:173

[2] چیمبرس انسائیکلوپیڈیا ج ۸

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں (۱) CAMBRIDGE MEDIAEVAL HISTRY. (۲) (SOCIAL AND POLITICAL IDEAS OF THE RENAISSANCE — HEARNSHAW.) (۳) THE RENAISSANCE — PETER.

[4] یاد رہے کہ اسی دور میں (۱۴۳۸ء) جرمنی کے گٹن برگ نے چھاپہ خانہ کی ایجاد کی تھی۔

ہوتے عقاید، تاریک خیالیوں، اوہام، من گھڑت رسموں، ہولناک رہبانی طریقوں، پُر پیچ ضابطوں سے مرکب تھا۔ اس مذہب کے ذریعے مذہبی طبقہ بے پناہ دولت بھی عوام سے حاصل کرتا تھا اور ان پر نہایت سخت مستبدانہ اقتدار بھی قائم کیے ہوتے تھا۔ کلیسائی ادارے ایک طرف عیاشی اور ہوس رانی کے اڈے بن گئے اور دوسری طرف بادشاہت کے مقابلے میں مذہبی اقتدار کو غالب رکھنے کے لیے وہ طرح طرح کی دسیسہ کاریوں اور سازشوں کے مرکز بھی ٹھہرے۔ تعیش پسندی کا حال یہ تھا کہ پوپ لیو دہم نے سابق پوپ کی جمع کردہ دولت پر ہاتھ صاف کیا، اپنے دور کی آمدنی کو اڑایا اور پھر اپنے جانشین کا حق پیشگی وصول کر کے اسے بھی خرچ کر دیا۔ اور سیاسی لحاظ سے کلیسا کے جوڑ توڑ کی قوت اتنی عظیم تھی کہ شاہ ہنری چہارم سکسنڈ کو پوپ کے حضور میں حاضر ہو کر عفو طلبی کرنی پڑی۔ مذہبی طبقہ کی اخلاقی حالت یہ تھی کہ بڑے بڑے پادریوں کے خلاف اخلاقی نوعیت کے الزامات عائد ہو رہے تھے۔ اور انسانی ضمیر کو کچلنے میں کلیسا کی بے باکی اتنی بڑھ گئی کہ ذرا سی اختلافی آواز اٹھانے کے گنہگار کی وہ تکفیر کر کے اسے قتل کر دیتے یا زندہ جلوا دیتے۔[1]

مسلم فاتحین، ان کی درسگاہوں، ان کی تصانیف و تراجم، ان کی بحثوں اور ان کی مذہبی زندگی کے عملی مظاہر نے اہلِ مغرب پر جو فوری اثرات پیدا کیے ان کا اندازہ ہم گلاڈیس (GLADIUS) نامی لاٹ پادری کے ذہنی انقلاب سے کر سکتے ہیں۔ دوسری صدی ہجری میں اندلس کی نئی فضا میں پرورش پا کر وہ بت پرستی کے خلاف دعوتِ اصلاح لے کے اٹھا اور اپنے وعظوں کے دوران میں وہ مجمعوں کے سامنے تصویریں اور صلیبیں جلا دیا کرتا تھا۔ اسی طرح شاہانِ روما میں سے لیو سوم، قسطنطین پنجم اور لیو چہارم تصویر پرستی کے خلاف ہو گئے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (۱) مسلمانوں کا عروج و زوال از مولانا ابوالحسن علی ندوی (۲) انسانیت کی تعمیر نو از پروفیسر عبدالحمید صدیقی۔ (۳) تاریخ انقلاباتِ عالم۔ مولانا ابوسعید نیرمی مرحوم (۴) معرکۂ مذہب و سائنس، مولانا ظفر علی خاں مرحوم۔ (۵) تاریخ اخلاق یورپ۔

۷۲۶ء میں باقاعدہ سرکاری فرمان سے تصاویر اور بتوں کی تقدیس کی ممانعت کی گئی۔ اسی طرح شہادت موجود ہے کہ کالون (CALVIN) کے اختیار کردہ بعض عقائد اور فقہی مسائل یونانی کلیسا کے بجائے اسلامی علماء کے تصورات سے مشابہ تھے۔

ذہنی بیداری (RENAISSANCE) جو مسلمانوں سے میل جول، جنگ و جدال، بڑھتی ہوئی نقل و حرکت، سیاحت و مشاہدات، توسیع پذیر تجارت، بحری سفروں کے فروغ، خود مختار اور نیم آزاد شہروں کے وجود، یونیورسٹیوں کے قیام، کاغذ سازی کی ترقی اور چھاپے خانے کی ایجاد کے مختلف عوامل کا نتیجہ تھی، اس کی ابتدائی لہروں نے اپنا راستہ عقلی علوم شعبہ ہائے ہنر اور ادب و فنون کے میدانوں کی طرف نکالا یونانی تراجم کی مانگ پیدا ہوئی اور گذشتہ تمدنوں کے شاندار مظاہر کی طرف توجہ ہوئی جس کی وجہ سے یہ احساس بڑھنے لگا کہ ہماری موجودہ زندگی نہایت پست ہے۔ نظری امور میں دلیل، عملی فنون میں تجربہ اور ثقافتی معاملات میں حسن کی اہمیت بڑھ گئی۔ شروع میں یہ رو مذہبی دائرہ سے باہر باہر ہو کر چلی مگر آخر تصادم ناگزیر تھا۔ انجیل کی روائتی تفسیر، کلامی منطق اور افسانہ ہائے پارینہ کے مقابلے میں جب لوگوں کی توجہ فلسفہ، جغرافیہ، طب اور دوسرے طبیعاتی علوم کی بحثوں نے کھینچی اور جب نئے نظریات کلیسائی تصورات کو متزلزل کرنے لگے تو کلیسا نے ذہنوں اور ضمیروں کو کچل دینے کی ٹھانی۔ آگے چل کر عدالت احتساب (INQUISITION) قائم ہوئی اور اس نے ایک ایک آزاد خیال کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کیا۔ اس عدالت کا شکار ہونے والوں کی تعداد ۳ لاکھ سے کم نہ تھی جس میں ۳۲ ہزار کو زندہ جلایا گیا ۔ برونو (BRUNOE) اور گلیلیو (GALILIO) جیسے علما نہایت بے ضرر اور معمولی انکشافات کی بنا پر اس عدالت کی بھینٹ چڑھے[1]

---

[1] ملاحظہ ہو: THE PREACHINGS OF ISLAM - T.W. ARNOLD [2] 1- THE INQUISITION — MAYCOCK. 2- MEDIEVAL HERESY AND THE REQUISITION — TURBURVILLE.

پاپائیت کے جرائم کا پیالہ جب خوب لبریز ہوگیا تو عوام کے اندر اضطراب کا لاوا ابلنے لگا۔ پھر اس لاوہ نے بہاؤ کے راستے نکالے۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے کلیسا کے خلاف آواز اٹھائی ان میں خود کلیسا کا ایک وفادار فرزند بھی پیش پیش تھا۔ یہ تھا ڈیزیڈیریس ارازمس (DESIDERIUS ERASMUS) جو ہالینڈ میں پلا اور ایک لاطینی اسکول ڈیونٹر (DEVENTER) میں تعلیم سے بہرہ مند ہوا۔ وہ باقاعدہ راہب بن کر ایک خانقاہی حلقہ میں رہا۔ سیاحت کر کے اس نے زمانے کا رنگ خوب دیکھا۔ پھر اس نے مضمون نگاری شروع کی اور اپنے شذرات میں گرجاؤں اور درویشوں کا حال زار پوری طرح الم نشرح کیا۔ پھر اس نے "تحسین حماقت" (PRAISE OF FOLLY) کے دلچسپ عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں راہبوں اور ان کے مریدوں کا پول کھولنے کے لیے طنز و مزاح جیسا کامیاب ہتھیار استعمال کیا۔ سولہویں صدی میں یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ بکا اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے۔ اس کی تحریری مہم نے لوگوں کو چونکا دیا۔

ارازمس قلم کش تھا، لیڈر نہ تھا۔ کلیسا کے خلاف تحریک چلانے کے لیے جس لیڈر کی ضرورت تھی وہ مارٹن لوتھر کے پیکر میں نمودار ہوئے۔ مارٹن لوتھر شمالی جرمنی کے کسانوں میں سے اٹھا، اس نے ارفرٹ (ERFURT) یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور ایک خانقاہی حلقے میں شامل ہوگیا۔ پھر وہ ڈین برگ کے اسکول میں دینیات کا پروفیسر تھا۔ یہاں اس نے کتاب مقدس کا مطالعہ کرتے ہوئے اس تضاد کو محسوس کیا جو تعلیمات مسیح اور پوپ اور بشپوں کے مواعظ میں تھا۔ اس کے ذہن میں بغاوت کی لہر اٹھنے لگی۔ آخری محرک یہ پیدا ہوا کہ الگزینڈر ششم چونکہ پاپائی خزانے کا صفایا کر گیا تھا جس کی ایجنسی مقامی پادری (JOHN-TETZEL) کے پاس تھی۔ لوتھر کے صبر کا پیمانہ اس موقع پر لبریز ہوگیا۔ ۳۱ اکتوبر ۱۵۱۷ء کو اس نے ایک سنگین قدم اٹھا دیا۔ اس نے ۹۵ نکات کاغذ پر لکھے اور

ملاحظہ THE STORY OF MANKIND. P.256-258

اسے عین گرجا کے دروازے پر جا کر آویزاں کر دیا اور پادری کو مناظرہ کا چیلنج دیا۔ لوتھر کے خیالات کا خلاصہ یہ تھا کہ صرف انجیل مذہب کے لیے سند ہے اور اس پر عمل کرنا نجات کے لیے واحد ذریعہ ہے، خدا اور بندوں کے درمیان کسی واسطے کی حاجت نہیں، پادریوں کے ذریعے ان کی ایجاد کردہ رسوم کا عمل میں آنا کوئی مذہبی ضرورت نہیں۔ عشائے ربانی کی تقریب سے متعلق عقیدے باطل ہیں اور مذہبی بزرگوں کے بتوں کی پرستش عیسائیت کے خلاف ہے۔ دو مہینے کے قلیل عرصے میں لوتھر کے ۹۵ نکات پر بحث کا طوفان سارے یورپ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ قبل اس کے کہ وہ احتساب کے شکنجے میں کسا جائے لوتھر کے حامیوں کی بیشمار صفیں ابھر آئیں۔ ۱۵۲۱ء میں دریائے رائن کے کنارے ڈائٹ (DIET) کا اجلاس عام بلایا گیا اور چارلس پنجم کے حکم سے لوتھر سے جواب طلبی کی گئی۔ لوتھر نے اپنا ایک لفظ بھی واپس لینے سے انکار کر دیا۔ اس بنا پر کہ اس کا ضمیر کلمات الٰہی کا پابند ہے اور وہ ضمیر ہی کے لیے جیے اور مرے گا! ڈائٹ نے اسے خدا اور انسانیت کا باغی قرار دے کر حکم جاری کر دیا کہ کوئی شخص اسے جگہ نہ دے، نہ دانہ، نہ پانی اور نہ اسے باغیانہ تقریروں کا کوئی لفظ پڑھنے دیا جائے۔ مگر وہ وارٹ برگ کی ایک گڑھی میں محفوظ بیٹھ گیا اور اس زمانے میں انجیل کا ترجمہ کر ڈالا تاکہ ہر شخص خود اسے پڑھے اور احکام الٰہی کو جانے۔ اس طرح مذہبی علم کے قدیم خم کی مہر ٹوٹ گئی۔[1]

یوں پروٹسٹنٹ تحریک چلی اور پھر اس کے نتیجے میں مذہبی آزاد خیالوں کا ایک مذہب و مسلک وجود پا گیا۔

لوتھر، کالون اور اصلاح مذہب کے دوسرے علمبرداروں کو کام کرنے کا موقع اس کشمکش کی وجہ سے ملا جو پاپائیت اور بادشاہت کے درمیان شدت سے جاری تھی۔ یہ لوگ اپنی جدوجہد میں دنیوی طاقت کی حمایت کے محتاج تھے تاکہ وہ اپنے آپ کو پنجۂ عقوبت میں

[1] ملاحظہ ہو: HISTORY OF THE REFARMATION — LINDSARY

گرفتار ہونے سے بھی بچا سکیں اور کیتھولک بادشاہوں اور پاپائیت کے درمیان اپنے آپ کو توازن کے ساتھ قائم رکھ سکیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے پاپائیت کے مخالف بادشاہوں کا دامن تھام کر یہ معرکہ جاری رکھا۔ بنابریں مطلق العنان حکمرانی کا جو ادعا بادشاہوں کی طرف سے کیا جا رہا تھا یہ لوگ اس کی تائید کرنے پر مجبور ہوئے چنانچہ یہ "مطلق العنان بادشاہت کے محافظین" (DEFENDERS OF THE ABSOLUTE MONARCHY) قرار پائے۔ یہ ایک عجیب صورت تھی کہ ایک طرف مذہبی دائرے میں یہ عام انسان کو پادریوں کے مقابلے میں مساویانہ اور جمہوری مرتبہ دلوا رہے تھے اور دوسری طرف بادشاہوں کی خدائی کی گرفت مضبوط کر رہے تھے خصوصاً کالونزم (CALVINESUM.) اور زونگلزم (ZWINGLISM) نے کلیسا اور ریاست کو ایک کرنے کی ٹھانی، نیز وہ تمام بادشاہ جو پاپائے روم کا قلادہ گلے سے اتار سکے انہوں نے اپنے آپ کو خدائی نمائندہ اور بالاتر یں سرپرستِ مذہب بھی قرار دے لیا۔ اس طرح قومی بادشاہتوں کی مطلق العنانی کا زور وحدتِ روما کے ٹوٹنے کے بعد اور بھی بڑھ گیا۔ اصل میں اصلاح پسندوں کے لیے دو خوفناک طاقتوں سے بیک وقت لڑنا قابلِ عمل نہ تھا۔ مگر آزاد خیالی اور جمہوریت کی جو رَو مذہبی دائرے سے ایک بار اٹھ گئی تھی، آگے چل کر اس سے سیاسی دائرہ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ عام لوگوں نے جب پاپائیت کے خلاف جنگ لڑنے کے بعد بھی اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ محکوم و مجبور پایا تو ان کی ذہنی آزادی کی لہروں نے ایوانِ بادشاہت کی طرف رُخ کر لیا۔ اس طرح جمہوری تحریک چلی۔

یونانی جمہوریت کا تصور

تبدیلی کی تحریک کسی بھی طرف سے ہو، انسانی معاشروں کا معمول یہ ہے کہ وہ مستقبل کی تعمیر کے لیے اپنی ہی ماضی سے سرمایۂ فکر حاصل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ یورپ کے لیے اولین ذہنی تحریک تو اسلام نے بہم پہنچائی، لیکن مسلمانوں سے سرمایۂ فکر حاصل کرنے میں تعصب مانع ہوا۔ اس تعصب کے نقش لٹریچر اور تاریخ میں محفوظ ہیں بلکہ یہ آج تک بھی ایک حد تک کام کر رہا ہے۔ مسلمانوں کو نہایت شدت سے

جاہل، کافر، مشرک، بے دین اور بدعتی کہا جاتا تھا اور قرآن یا دوسرے علومِ دینی کے لیے ان کے دروازے بند تھے حتیٰ کہ شجاعت کی روح سے آراستہ جو گروہ اس دور میں ان کے اندر نائٹ (KNIGHTS) کے نام سے ابھرا وہ اپنے حلف میں ہر مصیبت زدہ کی مدد کرنے کا اقرار اس لازمی استثنا کے ساتھ کرتا تھا کہ "بشرطیکہ وہ مسلمان نہ ہو" ورنہ اسے دیکھتے ہی قتل کر دینا اس کا فرض تھا۔[۱] بنا بریں وہ مسلمانوں کے جن نظریات و معمولات سے متاثر ہوتے انہیں اپنے ہی ماضی کے خزائن سے تلاش کرنا چاہتے۔ مساوات کے اصول پر جمہوری طرزِ زندگی اور اس کے ساتھ ساتھ علمی و تمدنی ترقی کا ایک مثالی دور انہیں یونان کے ماضی میں دکھائی دیا اور دوسرا ایک دور روما میں۔ یونان سے ان کا ذہنی رشتہ تازہ کرنے کا واسطہ بھی مسلمان بنے۔ مسلمانوں میں خود اس عہد میں یونانی علم و تمدن سے ایک مرعوبیت پیدا ہو گئی تھی اور یونانی علوم کے تراجم کر کر کے وہ اپنے نظریات کو ان کے ساتھ ہم آہنگ کر رہے تھے اور ارسطو اور افلاطون کو خوب اچھال رہے تھے۔ پس یورپ نے ان سے اسلام کا پیغام قبول کرنے کے بجائے یونانی علوم کا پیغام قبول کر لیا۔ ہنڈرک وان لون کے بقول فلورنس میں یونانی زبان سیکھنے کی رو چل نکلی اور ہر کوئی ارسطو، ہومر اور افلاطون کے مطالعہ کا شائق ہو گیا۔[۲] بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ فلورنس میں عشرت پسندانہ یونانی ثقافت کا احیاء ہوا۔ اسی لیے اسے عظیم الشان مرکزِ احیاء قرار دیا گیا۔ اس مخالفِ مذہب رَو کو روکنے کے لیے ایک جیالے پادری سوانرولا (SAVANARALA) نے وقتی کامیابی حاصل کی مگر جلد ہی حالات پلٹ گئے اور اسے مجرم قرار دے کر اذیت ناک طریق سے سولی دیا گیا اور اس وقت عوام خوشی سے تالیاں بجا بجا کر ناچے۔[۳]

صورتِ یورپ نے جمہوری دور کے آغاز کے لیے تحریک تو مسلمانوں سے حاصل کی، مگر نظریات

---

[۱] THE STORY OF MANKIND P:160

[۲] THE STORY OF MANKIND. P:216 [۳] DUTY.

یونان سے لیے اب ہمارے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم جمہوریت کی کہانی کو آگے لے چلنے کے بجائے پانچویں صدی قبل مسیح میں لے چلیں:

یونان میں یک شہری جمہوری اشرافی ریاست کا جو تجربہ عمل میں آیا وہ جن بہت سے جغرافی اور تاریخی اسباب کے تحت ممکن ہوا ان میں سے ایک بڑا عامل یونانی علم و حکمت کی پیدا کردہ فضا تھی جسے ہومر، تھیلز، اناکسیمینڈر، فیثاغورث، ہیراکلیٹس، پرمینائیڈز، ایمپیڈوکلیز، انیکساغورث، لیوکیپس، ڈیماکریٹس، پروٹاغورث، سقراط، افلاطون اور دوسرے بیشمار فطین اصحاب کی کاوشوں نے بنایا تھا۔ ان میں سے سقراط کا امتیازی مقام یہ ہے کہ اس نے اپنے خون کے روغن سے روحِ جمہوریت کے چراغ کو روشن کر دیا۔ وہ گویا یونان کا ضمیر تھا۔ بعید نہیں کہ وہ خدائی نظامِ ہدایت کے سلسلے کی ایک کڑی ہو، کیونکہ نہ صرف عقیدۂ توحید، بلکہ اس کا سارا کردار پیروانِ الہام سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے خلاف سرکاری بتوں کی عبادت سے انحراف اور نوجوانوں میں تخریبی رجحانات پھیلانے کے الزام میں جو مقدمہ چلایا گیا تھا اور جو سزائے موت سنانے پر ختم ہوا اس کے چند اقتباسات یہاں لانے ضروری ہیں تاکہ اندازہ کیا جا سکے کہ سقراط کے افکار سچی جمہوریت کے کتنے قیمتی بیج اپنے اندر رکھتے تھے۔ آخر ضمیر کے مطابق سچائی کی آواز اٹھانے اور حکومت سے اختلاف کرنے کے حق کو بچانے کے لیے جو شخص جان دے دیتا ہے اس سے بڑھ کر معلمِ جمہوریت کون ہو گا۔

سنیے سقراط اپنے قاتلوں کے سامنے بیان دے رہا ہے:۔

"خدا ہے جو مجھے ہدایت کرتا ہے کہ میں اپنے اور دوسرے لوگوں کے اندر جھانک کر اربابِ دانش و بینش کا سا نصب العین پورا کروں۔"

"ایتھنز کے لوگو! میں تمہاری عزت کرتا ہوں اور تم سے محبت رکھتا ہوں، لیکن میں صرف خدا کی اطاعت کروں گا، تمہاری نہیں! اور جب تک مجھے زندگی اور قوت حاصل ہے میں حکمت کی تعلیمات پر عمل کرنے اور ان کو پھیلانے سے

ہرگز باز نہیں آؤں گا . . . . کیونکہ تم جان لو کہ یہ خدا کا حکم ہے اور میں اعتقاد رکھتا ہوں کہ میری فرماں برداریٔ خدا سے عظیم تر کوئی بھلائی اس ریاست میں نہیں پائی گئی"

سزائے موت کا فیصلہ ہو جانے پر وہ آخری تقریر میں کہتا ہے :-

"اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر آپ کسی کو اپنی فاسد زندگیوں پر ملامت کرنے سے روک سکیں گے تو آپ غلطی پر ہیں، فرار کا یہ طریقہ نہ تو ممکن ہے، نہ عزت مندانہ۔ آسان اور شریفانہ راستہ یہ نہیں کہ آپ دوسروں کو بے بس کر دیں، بلکہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو بہتر بنائیں"

"اب ہمارے جدا ہونے کی گھڑی آگئی ہے اور ہم اپنے اپنے راستے پر مڑ جانے والے ہیں ـــــ میں مرنے کے لیے اور آپ جینے کے لیے: کونسا راستہ بہتر ہے، یہ صرف خدا ہی جانتا ہے[1]"

دراصل سقراط دلوں کو جھنجھوڑ دینے والی ایک تحریک لے کے چلا تھا، اس کے شاگرد افلاطون نے تحریک کو چھوڑ کر تفلسف کی راہ اختیار کی مگر جو کچھ دیا وہ نظری متاع تھی، پھر اس کے بعد ارسطو آتا ہے جس نے افلاطون کی نظری تعلیمات سے آگے بڑھ کر ماحول کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک عملی نظریہ دیا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ارسطو جدید مغربی فلسفہ کا باوا آدم قرار پایا۔ لیکن یہاں ہم کو یونانی فلسفہ کی سیر کرنے کے بجائے شہری جمہوریت کا جائزہ لینا ہے۔

**شہری جمہوریت** بابل کے شاہ حمورابی کے کئی صدیاں بعد ہم ایک گروہِ انسانی کو دریائے ڈینیوب کے کنارے جنوب کی طرف کسی شاداب علاقے کی تلاش میں گامزن دیکھتے ہیں یہ لوگ ہیلین (HELLENS) تھے۔ انہی لوگوں نے یونان، علاقۂ ایجیئین اور ایشیائے کوچک

---

[1] ملاحظہ ہو: HISTORY OF WESTERN PHILOSOPHY-BY BERTREND RUSSEL. CH: XI

کے ساحلی رقبوں کو آباد کیا، انہوں نے وحشت و بدویت کے دور سے آگے نکل کر اپنی تہذیب بنائی اور انہی کے ہاتھوں یورپ کی تاریخ کا پہلا باب کھلا۔

یہ لوگ بدویانہ آوارہ گردی کے بعد جب مقیم ہوئے تو انہوں نے الگ الگ شہر (جو آج کل کے بڑے گاؤں جتنے تھے) بسائے اور ہر شہر معاشرتی و سیاسی لحاظ سے ایک مستقل یونٹ بنا۔ انہی میں سے ایتھنز اور اسپارٹا بھی تھے۔ ہر بدوی قوم میں آزادی کا ذوق زوردار ہوتا ہے (جس کی مثال عرب قبل از اسلام میں بھی ملتی ہے) اور اسی ذوقِ آزادی نے یونانیوں کو ایک وسیع سلطنت کے تحت جمع ہونے کے بجائے الگ الگ آزاد معاشروں کی شکل میں جینا سکھایا۔ شروع میں یہ شہری معاشرے مشترک ملکیت اور معاشی مساوات کے سادہ بدویانہ اصول پر قائم ہوئے۔ بستی کے تمام لوگ مل کر کسی ایک کو سردار بنا لیتے اور وہ اگر غلط رُخ اختیار کرتا تو اسے برطرف کرنے کا حق عام لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا۔ بعد میں آہستہ آہستہ آبادی خوش حال اور تنگ حال لوگوں میں تقسیم ہوتی گئی اور عام محنت کار آبادی کے مقابلے پر رؤسا (NOBLES) کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا۔ یہ لوگ دوسروں سے کام لینے کی وجہ سے آسانی سے بہترین ہتھیار جمع کر لیتے تھے اور جنگی فنون میں مہارت پیدا کرنے کے لیے فارغ اوقات رکھتے تھے۔ یہ مضبوط عمارات میں رہتے تھے اور جنگ جو سپاہیوں کی خدمات خرید سکتے تھے۔ یہ نو بل لوگ ایک دوسرے کے خلاف جنگ آزمائی کرتے اور فاتح آس پاس کی آبادیوں پر ایک طرح کی بادشاہت جما لیتا، تا آنکہ کوئی دوسرا نو بل اسے قتل کر دے یا بھگا دے۔ ایسے حکمرانوں کو مستبد حکمراں (TYRANT) کہا جاتا تھا اور چھٹی اور ساتویں صدی قبل مسیح کے دور میں یونانی شہروں پر ایسے ہی جابر لوگ مسلط تھے۔ خود ایتھنز بھی اس مصیبت کا شکار رہا۔ بالآخر جب یہ حالات ناقابلِ برداشت ہو گئے تو اصلاح کے لیے نئی راہ نکالی گئی جو یونانیوں کو شہری جمہوریت تک لے گئی۔ لوگوں میں ایک قانون یا دستور کی طلب پیدا ہوئی جسے پورا کرنے کے لیے پہلا شخص ڈریکو (DRACO) آگے

بڑھا مگر اس کے قوانین اتنے سخت تھے کہ انہیں قبولیتِ عام حاصل نہ ہو سکی اب ایک دوسری شخصیت میدان میں آئی جس کا نام آج تک معروف ہے۔ یعنی حکیم سولن (SOLON) اور حکیم سولن کا قانون ایتھنز میں نافذ ہوا۔ سولن نے ایک طرف نوبل طبقے کے مفادات کو محفوظ رہنے دیا اور دوسری طرف غربا کی بہتری کی قدرے گنجائش نکالی۔ اس کے قانون کے دو جمہوری اجزا بڑی اہمیت رکھتے ہیں :-

۱- ہر شہری (محنت کار غلام اور تمام غیر ملکی شہریت کے حق سے یونان میں ہمیشہ محروم رکھے گئے) کے لیے شہر کے معاملات میں براہِ راست ذاتی دلچسپی لینا اور آبادی کی مجلس میں حصہ لینا لازم تھا۔

۲- ہر شہری کو اپنی شکایات ۱۲ افراد کی ایک مجلس کے سامنے لے جانے کا پورا حق تھا۔

بعد میں ایک اور شخصیت لائی کرگس بھی ایسی سامنے آتی ہے جس نے جذبۂ اصلاح کے تحت اسپارٹا کے لیے ایک بہتر نظامِ قانون وضع کرنے کا تہیہ کیا اور اس مقصد کے لیے سفر کر کے مختلف نظاموں کا مطالعہ کیا۔ ہم اس کا ذکر بعد میں کریں گے۔ یوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یونانی دماغ ایک صحیح نظام کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے اور نظریات سے فلسفہ کا دامن مالا مال ہو گیا لیکن الٰہی ہدایت کی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے ایک نظامِ عدل کبھی بھی پیدا نہ ہو سکا۔ بلکہ حق یہ ہے کہ دورِ جاہلی کا مکہ بہ حیثیت یک شہری ریاست کے ایتھنز اور اسپارٹا کی ریاستوں سے بدرجہا بہتر، منظم تر اور آزاد تر نظام کا حامل تھا اور مکہ کی جمہوریت زیادہ درخشاں تھی۔ مگر اسلامی انقلاب اتنی بڑی چیز تھا کہ مکہ کی شہری ریاست اس کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔ بہ ہر حال آئیے یونان کی شہری ریاست کا بہترین نمونہ اسپارٹا میں ملاحظہ کیجیے۔ نظامِ عمل کے اہم نکات یہ تھے :-

(۱) دو مختلف خاندانوں سے دو بادشاہ بیک وقت ہوتے تھے اور ان کا حق

فرماں روائی موروثی خطوط پر چلتا تھا۔ دونوں میں سے کوئی ایک جنگ میں کمانڈ کرتا تھا۔ زمانۂ امن میں ان کے اختیارات محدود ہوتے تھے۔ اجتماعی ضیافتوں میں ان کو دگنا کھانا ملتا تھا۔

(۲) ایک مجلسِ اکابر ہوتی تھی جس میں دونوں بادشاہوں کے علاوہ ۳۰ افراد (۶۰ سال سے زائد عمر کے) شہریوں سے چُنے جاتے اور وہ بالعموم اونچے خاندانوں سے لیے جاتے تھے۔ یہ لوگ تاحینِ حیات منصب پر رہتے۔ یہ مجلس فوجداری مقدمات سنتی تھی اور شہریوں کی مجلس عام کے سامنے لانے کے لیے مسائل کو تیار کرتی۔

(۳) شہریوں کی مجلسِ عام جب تک کسی قانون یا فیصلے کو منظوری نہ دے وہ چل نہیں سکتا تھا۔ مگر مجلسِ عام بطورِ خود کوئی تحریک نہیں کرتی تھی (یہ کام مجلسِ اکابر کا تھا) یہ صرف "ہاں" یا "نہ" کی صورت میں رائے دیتی تھی۔ مجلسِ عام کی منظوری اگرچہ ضروری تھی مگر فیصلوں اور اقدامات کے لیے کافی نہ تھی، کیونکہ لازمی یہ بھی تھا کہ اکابر اور مجسٹریٹ فیصلوں کی توثیق کریں۔

(۴) ایک چوتھا ادارہ حکومت بھی تھا جو پانچ نگرانوں (EPHORS) پر مشتمل تھا اور یہ لوگ مجسٹریٹ ہوتے تھے۔ ان پانچوں کا انتخاب مجلسِ عام سے بذریعہ قرعہ اندازی ہوتا تھا۔ یہ ادارہ اسپارٹا کے دستور میں جمہوریت کا ایک اہم عنصر تھا۔ یہ "پنچایت" ایک طرف سپریم کورٹ کی حیثیت رکھتی تھی اور دوسری طرف بادشاہوں پر نگراں تھی۔ ہر مہینے بادشاہ دستور کے تحفظ کا حلف لیتے تھے اور پانچوں نگران یہ حلف لیتے تھے کہ وہ بادشاہوں کو اس وقت تک قائم رکھیں گے جب تک وہ اپنے حلف کے پابند رہیں۔ کوئی بادشاہ جب جنگ کے لیے نکلتا تو دو نگران ساتھ جاتے۔ یہ پنچایت بادشاہوں کے خلاف فوجداری کاروائی تک کر سکتی تھی۔ اوپر حکیم سولن کے نظام میں ۱۲ افراد پر مشتمل ایک جیوری کا تذکرہ ہم کر ہی چکے ہیں۔ جو انتخاب کے لیے مقرر کی گئی تھی۔

اس دستوری نقشے میں جمہوریت کا سب سے بڑا پہلو یہ تھا کہ شہر کی ساری آبادی نظامِ حکومت میں براہِ راست حصہ دار تھی۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ فرماں روا دستور و قانون سے بالاتر

اور ناقابلِ عزل نہ تھے۔ دوسری طرف تضاد اتنا تھا کہ غلاموں، محنت کاروں، اور غیر ملکی آبادی کو شہریت سے محروم قرار دیا گیا تھا۔ آبادی کو مستقلاً سیاست کار اور جنگ جو شہریوں اور کاشت کاروں اور پیشہ وروں کے دو طبقوں میں بانٹ دیا گیا اور یہ طبقاتی تقسیم موروثی طور پر آگے چلتی تھی۔ علاوہ بریں جہاں تک فرد کی آزادی کا معاملہ ہے، اسپارٹا کی جمہوریت اس پہلو سے کسی فاشستی نازی یا کمیونسٹ حکومت سے بہتر نہ تھی۔ آزادی اجتماعی ہیئت کے لیے تھی، افراد کے لیے نہیں۔ کوئی شخص اپنی پسند کے مطابق زندگی نہیں گزار سکتا تھا بلکہ کمپ کی سی منظم زندگی کا وہ پابند تھا۔ اسپارٹیوں کو ناگزیر صورتوں کے بغیر سفر تک کرنے کی اجازت نہ تھی۔

مناسب ہوگا کہ ہم اسپارٹا کے نظام کا جائزہ اخلاقی حیثیت سے بھی لیتے چلیں۔ ہیروڈوٹس جسے اسپارٹا کے دورِ عظمت کے سایے میں رہنے کا موقع ملا، کہتا ہے کہ ایک اسپارٹی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ رشوت کی پیش کش پر اپنا ضمیر بیچ سکے جنسی لحاظ سے بگاڑ اتنا تھا کہ منتخب بادشاہوں کو بسا اوقات اس بنیاد پر برطرف کر دیا گیا کہ وہ ولد الحرام تھے۔ ارسطو نے اپنے ناقدانہ جائزے میں کہا ہے کہ نگران (EPHORS) غریبی کی وجہ سے آسانی رشوت کا شکار ہو جاتے تھے۔ حالانکہ ان کا اختیار بادشاہوں سے بالاتر تھا۔ یہ لوگ دستور کے منشا کے خلاف زیادہ مزے کی زندگیاں گزارتے تھے۔ عام شہری پابندیوں کا بوجھ زیادہ ہونے کی وجہ سے خفیہ اور غیر قانونی طریقوں سے اپنی خواہشات پوری کرتے تھے۔ یونان کی افسانوی تاریخ کے دفاتر میں سے اگر لائی کرگس اور پلوٹارچ (PLUTARCH) کا آئینہ افکار اٹھا کے اسپارٹا کا عکس دیکھیں تو لڑکیاں نوجوان لڑکوں کے سامنے اور ساتھ لباس سے آزاد ہو کر کھیلتی، جسمانی مشق کرتی اور ناچتی دکھائی دیتی ہیں، ہر دیانت دار مرد کو قانوناً آزادی حاصل ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کی منکوحہ سے ملوث ہو بچے کسی فردِ واحد کے نہیں بلکہ معاشرہ کی ملکیت ہیں اور ناقص الخلقت بچوں کو پانی میں ڈبو کر ختم کر دیا جاتا ہے اور سات برس کی

عمر میں وہ گھروں سے اقامتی درسگاہوں میں منتقل کر لیے جاتے ہیں۔ انہیں ہوشیار بننے کے لیے چوری کرنا سکھایا جاتا تھا مگر پکڑے جانے پر اس نالائقی کی سزا دی جاتی تھی کہ وہ پکڑے کیوں گئے۔ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہم جنسی محبت کرنا تسلیم شدہ اور مروج ضابطہ تھا۔ اخلاقی فساد کی یہی رو فی الحقیقت یونانی تمدن کی تباہی کا باعث بنی۔

یہ تھی یونان کی وہ جمہوریت جس کا یورپ میں خوب ڈنکا بجایا جاتا رہا۔

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شہری نظام حکومت میں جمہوریت کا عنصر موجود ضرور تھا اور اسی کو یونان کے دورِ آخر کے فلسفہ نے اپنے ساتھ لے کر نظری حیثیت سے مزید نشو و نما دی اور پھر یونانی فلسفیوں کے سیاسی نظریات جدید سیاسی تفکر کا نقطۂ آغاز بنے۔

---


قربانی پر وقت کی معرکۃ الآرا کتاب

# تحقیقِ قربانی

از مولانا قاضی عبدالنبی کوکب

اگر آپ قربانی کی اصل حقیقت کی تفہیم ——

—— قربانی کے ہر پہلو پر علمی مطالعہ —— اور

مسئلے کی تسلی بخش وضاحت چاہتے ہیں ——

—— تو یہ کتاب پڑھیے۔

صفحات ۲۰۰ - مجلد گرد پوش - قیمت دو روپے

مکتبہ ابناء الاسلام، چیمبرلین روڈ - لاہور